QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

ماحولیاتی بحران اور عالمی سیاست: مارکسی تناظر میں تجزیہ اور ممکنہ حل

ENVIRONMENTAL CRISIS AND GLOBAL POLITICS: ANALYSIS AND POSSIBLE SOLUTIONS FROM A MARXIST PERSPECTIVE.

Dr.Munir Abbas Sipra
Teacher, Department of Urdu, KIPS Head Office Lahore.
Dr.Munawar Amin
Assistant Professor, Deparment of Urdu, University of Southern Punjab,Multan.
drmunawaramin143@gmail.com

Abstract:

The environmental crisis is one of the most serious and unequal challenges facing the contemporary world. It manifests itself in climate change, the loss of biodiversity, increasing pressure on water and food resources, air pollution, and the rising levels of the oceans, affecting humanity as a whole. This crisis is not merely a scientific or natural problem; rather, it is largely a product of the capitalist system, which is based on profit maximization, the false notion of limitless growth, and the treatment of nature as a commodity for sale. The unjust structure of capitalist production concentrates global resources, deepens class inequality, and creates an imbalanced relationship between humans and nature.According to Karl Marx, industrial capitalism disrupted the natural material interaction between humans and nature, a phenomenon he described as the "metabolic rift." This rupture emerged through the urban–rural divide, industrial agriculture, and the relentless exploitation of resources. Contemporary eco-socialist thinkers argue that global warming, floods, droughts, pollution, and climate-induced migration are manifestations of this contradiction. Eco-socialism proposes democratic planning and collective needs as a sustainable alternative.

Keywords: Environmental Crisis , Global Politics, Possible Solutions , Metabolic Rift.,Marxist Perspective, Eco-socialism

آج کی دنیا کا سب سے سنگین اور غیر مساوی چیلنج ماحولیاتی بحران ہے۔ یہ بحران محض فطری عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ انسانی سماج کے طرزِ تولید اور سرمایہ دارانہ استحصال کی منطقی انتہا ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد سے مسلسل بڑھتے ہوئے کاربن اخراج، جنگلات کی کٹائی، معدنیات کی لوٹ مار اور منافع کی ہوس نے زمین کے توازن کو اس حد تک متاثر کیا ہے کہ اب یہ انسانی تہذیب کے لیے وجودی خطرہ بن چکا ہے۔ یہ بحران غیر مساوی بھی ہے کیونکہ اس کی ذمہ داری ان ممالک اور کارپوریشنز پر عائد ہوتی ہے جو سب سے زیادہ وسائل استعمال کرتے ہیں، جبکہ اس کے تباہ کن اثرات ترقی پذیر ممالک اور کمزور طبقات پر زیادہ پڑتے ہیں۔

ماحولیاتی بحران کے مختلف روپ موسمیاتی تبدیلی، حیاتیاتی تنوع کا خاتمہ، پانی اور خوراک کے وسائل پر دباؤ، فضائی سمندری آلودگی اور سمندری سطح میں اضافہ ہیں۔ گرین ہاؤس گیسز کا بے تحاشہ اخراج درجہ حرارت میں مسلسل اضافہ کر رہا ہے، جس سے موسمی شدتیں بڑھ رہی ہیں۔ طوفان، سیلاب، خشک سالی اور جنگل کی آگ عام ہوتی جا رہی ہیں۔ گلیشیئرز تیزی سے پگھل رہے ہیں، جو میٹھے پانی کے ذخائر کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ سمندری سطح کو بلند کر رہے ہیں، نتیجتاً جزیرہ نما ممالک اور ساحلی شہروں کو ڈوبنے کا خطرہ لاحق ہے۔ حیاتیاتی تنوع تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ ہزاروں انواع ناپید ہو چکی ہیں اور کروڑوں دوسری خطرے میں ہیں۔ فضائی آلودگی شہری آبادیوں کی صحت کو تباہ کر رہی ہے، جبکہ زرعی زمینوں کی کمی اور پانی کی قلت خوراک کی پیداوار کو متاثر کر رہی ہے۔ یہ تمام مسائل آپس میں جڑے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کو مزید شدید بنا رہے ہیں۔

یہ بحران محض ماحولیاتی نہیں بلکہ سماجی، معاشی اور سیاسی بھی ہے۔ یہ انسانی سرگرمیوں کا براہ راست نتیجہ ہے جو منافع اور ترقی کے نام پر فطری نظام کو بے دردی سے لوٹتا رہا ہے۔ سرمایہ داری کا مسلسل توسیع پسندانہ کردار، جس میں پیداوار اور کھپت کی کوئی حد نہیں، زمین کی صلاحیت سے کہیں زیادہ وسائل نکالتا ہے۔ نتیجتاً فطری نظام تباہ ہو رہا ہے اور انسانی تہذیب کو ایک ایسے نقطے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں سے واپسی مشکل نظر آتی ہے۔ اگر بروقت اور بنیادی تبدیلیاں نہ کی گئیں تو یہ بحران آنے والی نسلوں کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث بنے گا۔

اگر اس بحران کے اسباب اور وجوہات جاننے کے لیے باریک بینی سے دیکھا جائے تو ماحولیاتی بحران کو صرف ایک تکنیکی یا فطری مسئلہ نہیں سمجھا جا سکتا، بلکہ یہ سرمایہ دارانہ نظامِ پیداوار کے اندرونی تضادات اور حرکیات سے پیدا ہوا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے، فطرت انسان کے جسم کی توسیع ہے، اور انسان اپنی محنت کے ذریعے اس سے اپنے تعلق کو تشکیل دیتا ہے۔ مادی جدلیات کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دنیا میں ہر شے ایک مسلسل عملِ تغیر میں ہے، اور یہ تبدیلی تضادات کے تصادم سے جنم لیتی ہے۔ فطرت اور انسان کے درمیان تعلق بھی اسی جدلیاتی تعامل سے عبارت ہے۔ انسان فطرت سے مواد لیتا ہے، اس پر محنت کرتا ہے، اور اسے سماجی پیداوار میں ڈھالتا ہے، مگر اس عمل میں اگر عدم توازن پیدا ہو جائے تو تضاد جنم لیتا ہے۔ یہی تضاد آج ماحولیاتی بحران کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ کارل مارکس نے اس عدم توازن کو "میٹابولک رفٹ" (Metabolic Rift) کہا ہے، یعنی انسان اور فطرت کے درمیان وہ حیاتیاتی اور مادی رشتہ جو سرمایہ دارانہ پیداوار نے منقطع کر دیا ہے۔ مارکس کہتے ہیں: (ترجمہ ملاحظہ فرمائیں)

> "سرمایہ دارانہ پیداوار انسان اور زمین کے درمیان میٹابولک تعامل کو خراب کر دیتی ہے، یعنی وہ مٹی کو ان اجزاء کی واپسی روک دیتی ہے جو انسان کھانے پینے اور کپڑوں کی شکل میں استعمال کرتا ہے؛ اس طرح یہ مٹی کی دیرپا زرخیزی کے لیے ضروری شرائط کی خلاف ورزی کرتی ہے۔۔۔ مزدوری کے عمل کی سماجی ترکیب اور تنظیم کو ایک منظم طریقے میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جو مزدور کی انفرادی قوتِ حیات، آزادی اور خود مختاری کو کچل دیتا ہے۔۔۔ مزید بر آں، سرمایہ دارانہ زراعت میں ہر ترقی ایک فن کی ترقی ہے نہ صرف مزدور کو لوٹنے کا، بلکہ مٹی کو بھی لوٹنے کا؛ کسی مخصوص مدت کے لیے مٹی کی زرخیزی بڑھانے میں ہر ترقی، اس زرخیزی کے زیادہ دیرپا ذرائع کو تباہ کرنے کی طرف ایک قدم ہے۔ جتنا زیادہ کوئی ملک جدید صنعت کی بنیاد پر اپنی ترقی شروع کرتا ہے، جیسے مثلاً امریکہ، اتنی ہی تیز ہوتی ہے یہ تباہی کا عمل۔ اس لیے سرمایہ دارانہ پیداوار ٹیکنالوجی کو صرف اسی صورت میں ترقی دیتی ہے جب وہ تمام دولت کے اصل ماخذ مٹی اور مزدور کو کمزور اور ختم کر دے۔" (1)

سرمایہ دارانہ نظام میں پیداوار کا بنیادی مقصد انسانی ضرورت نہیں بلکہ منافع ہے۔ یہی منافع کی جستجو فطرت کے ساتھ انسانی تعامل کو مسخ کر دیتی ہے۔ سرمایہ دار فطرت کو محنت کے ایک مفت ذریعہ کے طور پر استعمال کرتا ہے، اور اس کا استحصال اسی طرح کرتا ہے جیسے وہ مزدور کا کرتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام فطرت کو سستے ذریعہ کے طور پر برتتا ہے یعنی وہ جنگلات، معدنیات، سمندر، اور ہوا کو ایسے وسائل سمجھتا ہے جنہیں لامحدود طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ پال برکیٹ (Paul Burkett) اپنی کتاب Marxism and Ecological Economics میں لکھتے ہیں: (ترجمہ)

> "سرمایہ دارانہ منطق میں فطرت کی قدر اس وقت تک ہے جب تک وہ منافع پیدا کر سکے۔ اس منطق کے تحت فطرت کی اندرونی خود مختاری اور حدود کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔" (2)

مادی جدلیاتی نظریہ ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ فطرت اور سماج ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ ایک ہی عملِ ارتقا کے دو پہلو ہیں۔ اسی حوالے سے فریڈرک اینگلز لکھتے ہیں: (ترجمہ ملاحظہ فرمائیں)

> "ہم اپنی فطرت پر انسانی فتوحات کی وجہ سے خود کو زیادہ خوش نہ سمجھیں۔ کیونکہ ہر فتح پر فطرت ہم سے بدلہ لیتی ہے۔ ہر فتح، یہ سچ ہے، پہلے تو وہ نتائج ضرور دیتی ہے جو ہم توقع رکھتے ہیں، مگر دوسرے اور تیسرے درجے میں بالکل مختلف، غیر متوقع اثرات پیدا کرتی ہے جو اکثر پہلے نتائج کو ہی ختم کر دیتے ہیں۔ وہ لوگ جو میسوپوٹیمیا، یونان، ایشیا اور دیگر مقامات پر جنگلات تباہ کر کے کاشت کے قابل زمین حاصل کرتے تھے، کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ جنگلات کے ساتھ نمی کے جمع ہونے کے مراکز اور ذخائر کو بھی ختم کر کے وہ ان ممالک کی موجودہ ویران حالت کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ جب الپس کے اطالیوں نے جنوبی ڈھلوانوں پر پائن جنگلات کاٹ ڈالے جو شمالی ڈھلوانوں پر بڑی احتیاط سے محفوظ کیے جاتے ہیں وہ انہیں ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ اس سے وہ اپنے پہاڑی چشموں کو سال کے زیادہ تر حصے میں پانی سے محروم کر رہے ہیں اور بارشوں کے موسم میں میدانی علاقوں پر مزید شدید سیلابوں کا سبب بن رہے ہیں۔ اس طرح ہر قدم پر ہمیں یاد دلایا جاتا ہے کہ ہم فطرت پر کسی فاتح کی طرح حکمرانی نہیں کرتے جیسے کوئی غیر ملکی قوم پر فتح حاصل کرنے والا کرتا ہے، یا جیسے کوئی فطرت سے باہر کھڑا ہو بلکہ ہم خود گوشت، خون اور دماغ کے

ساتھ فطرت کا حصہ ہیں، اس کے درمیان موجود ہیں، اور فطرت پر ہماری پوری غلبہ کی بنیاد صرف یہ ہے کہ ہم دیگر تمام مخلوقات سے بڑھ کر اس کے قوانین کو سیکھنے اور انہیں درست طور پر استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"(3)

فیڈرک اینگلز اس اقتباس میں انسان اور فطرت کے تعلق کو جدلیاتی اور ماحولیاتی نقطۂ نظر سے بیان کرتے ہیں، جہاں وہ خبردار کرتے ہیں کہ فطرت پر انسانی فتوحات کو زیادہ فخر کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے کیونکہ ہر ایسی کامیابی کے ابتدائی فوائد کے باوجود فطرت غیر متوقع اور تباہ کن نتائج کے ذریعے بدلہ لیتی ہے، جیسا کہ قدیم تہذیبوں میں جنگلات کی کٹائی سے پیدا ہونے والی ویرانی، نمی کے ذخائر کا خاتمہ اور شدید سیلابوں کی مثالیں واضح کرتی ہیں۔ اینگلز کی بنیادی بات یہ ہے کہ انسان فطرت کا بیرونی فاتح یا مالک نہیں بلکہ اس کا نامیاتی حصہ ہے۔ گوشت، خون اور دماغ سمیت اور ہماری برتری صرف فطرت کے قوانین کو سمجھنے اور انہیں درست استعمال کرنے میں مضمر ہے، نہ کہ انہیں نظر انداز کر کے قلیل المدتی منافع کے پیچھے بھاگنے میں، جو سرمایہ داری کی استحصالی سوچ کی تنقید بھی ہے اور جدید ماحولیاتی بحرانوں کی پیش گوئی کرتی ہے کہ ہم آہنگی کے بغیر کوئی بھی غلبہ عارضی اور خود تباہ کن ثابت ہوگا۔

ماحولیاتی تبدیلی اور بحران کی موجودہ صورت سرمایہ دارانہ عالمی سیاست سے براہِ راست جڑی ہوئی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام ترقی کے نام پر غیر محدود پیداوار اور لامحدود نشوونما کا حامی ہے، مگر اس عمل کی کوئی فطری حد نہیں رکھی گئی۔ اس کے نتیجے میں زمین کے وسائل، حیاتیاتی تنوع، اور ماحولیاتی نظام اپنی قدرتی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ جان بیری (John Barry) لکھتے ہیں: (ترجمہ)

"ماحولیاتی بحران، سرمایہ داری کی اس پیداواری منطق کا فطری نتیجہ ہے جس نے فطرت کو ایک معاشی شے میں تبدیل کر دیا ہے، نہ کہ ایک حیاتیاتی نظام کے طور پر برقرار رکھا ہے۔"(4)

یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے جب تک فطرت کے ساتھ سماجی تعلقات کی بنیاد منافع پر ہے، کوئی بھی "ماحولیاتی سرمایہ داری" یا "گرین کیپٹلزم" وغیرہ جیسی پالیسی حقیقی حل فراہم نہیں کر سکتی۔ جدید سرمایہ دارانہ ماڈل، جیسے کاربن ٹریڈنگ یا کاربن کریڈٹ مارکیٹ، جیسے اقدام متاثرہ ماحول اور خراب نظام کی بنیادی خرابی کا حل نہیں نکالتے بلکہ ماحولیاتی بحران کو منڈی کے ایک نئے گرداب میں شامل کر دیتے ہیں۔

عالمی سیاست میں یہ بحران سامراجی طاقتوں اور سرمایہ داری کے لیے اب یہ ایک نیا میدان جنگ بن چکا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک، جو تاریخی طور پر زیادہ کاربن اخراج کے ذمہ دار ہیں، ماحولیاتی معاہدوں کو اپنے اقتصادی مفادات اور سیاسی تسلط کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ "پیرس معاہدہ"، "گرین کلائمیٹ فنڈ (GCF)"، اور "COP کانفرنسز" سرمایہ دارانہ نظام کی گرین واشنگ (سبز دھوکہ) پالیسیز ہیں، جو حقیقی انصاف کی جگہ مارکیٹ پر مبنی حل اور ٹیکنالوجی کو فروغ دیتی ہیں۔ یہاں ان پالیسیز کی وضاحت کرنا ناگزیر ہے تاکہ حقائق پوری طرح سمجھنے میں آسانی رہے۔ دراصل پیرس معاہدہ، گرین کلائمیٹ فنڈ (GCF) اور COP کانفرنسز موسمیاتی تبدیلی سے نمٹنے کے عالمی نظام کے اہم حصے ہیں۔ پیرس معاہدہ 2015 میں طے پایا، جس کا مقصد دنیا کے درجہ حرارت میں اضافے کو خطرناک حد تک بڑھنے سے روکنا ہے، اس کے لیے ممالک گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں کمی کے وعدے کرتے ہیں۔ COP کانفرنسز اقوام متحدہ کے تحت ہونے والے سالانہ اجلاس ہیں جہاں مختلف ممالک موسمیاتی پالیسیوں، اہداف اور تعاون پر بات کرتے ہیں۔ جبکہ گرین کلائمیٹ فنڈ (GCF) ایک مالیاتی ادارہ ہے جو ترقی پذیر ممالک کو موسمیاتی تبدیلی کے اثرات سے بچاؤ اور صاف توانائی کے منصوبوں کے لیے مالی مدد فراہم کرتا ہے۔ سادہ لفظوں میں، یہ تینوں مل کر دنیا کو موسمیاتی بحران سے نکالنے کی عالمی کوشش ہیں۔ ان کے علاوہ "کاربن کریڈٹ مارکیٹ اور کاربن ٹریڈنگ" جیسے منصوبے امیر ممالک کو ماحولیاتی سدھار کی ذمہ داری سے آزاد کرتے ہیں، جبکہ ترقی پذیر ممالک تباہی کا سب سے بڑا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ اسی بات کی نشاندہی "جیمز گستاو اسپیتھ اپنی کتاب میں یوں بیان کرتے ہیں: (ترجمہ)

"صنعتی ملکوں کی معیشتیں مواد اور وسائل کو استعمال کرنے میں زیادہ بچت اور موثر ہو رہی ہیں، مگر فضلہ اور کوڑا کرکٹ کی مقدار اب بھی بڑھتی جا رہی ہے... یہ تو ہوا کہ معاشی ترقی اور وسائل کے خرچے کے درمیان فی شخص اور مجموعی پیداوار (جی ڈی پی) کے لحاظ سے کچھ فاصلہ پڑ گیا، لیکن مجموعی طور پر وسائل کا استعمال اور ماحول میں فضلہ کا بہاؤ بڑھتا ہی رہا۔ ہمیں وسائل کے کل خرچے میں کوئی پوری کمی کا ثبوت نہیں ملا۔ صنعتی معیشتوں میں جو خام مال اور وسائل سال بھر استعمال کیے جاتے ہیں، ان کا آدھا سے تین چوتھائی حصہ ایک ہی سال میں فضلہ بن کر ماحول میں واپس پھینک دیا جاتا ہے۔"(5)

اس اقتباس میں صنعتی معیشتوں کی ایک تلخ حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ وسائل کے استعمال میں کارآمدی بڑھنے کے باوجود فضلہ کی پیداوار مسلسل بڑھ رہی ہے، جہاں فی شخص اور جی ڈی پی کے لحاظ سے معاشی ترقی اور وسائل کے خرچے میں کچھ فرق تو نظر آیا، مگر مجموعی طور پر وسائل کا استعمال اور ماحول میں فضلہ کا بہاؤ بڑھتا رہا، اور ٹھوس کمی کا کوئی ثبوت نہیں ملا بلکہ صنعتی معیشتوں میں سالانہ داخل کردہ مواد کا آدھا سے تین چوتھائی حصہ ایک ہی سال میں فضلہ بن کر ماحول میں واپس پہنچ جاتا ہے۔ حالیہ رپورٹس، جیسے UNEP کی Global Waste Management Outlook 2024 اور World Bank کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس سے مزید تصدیق ہوتی ہے کہ عالمی فضلہ 2050 تک 70 فیصد تک بڑھ سکتا ہے اگر فوری اقدامات نہ کیے گئے، جبکہ CO_2 ایمیشنز میں کچھ ممالک میں معیشت تو بڑھ رہی ہے لیکن ماحولیاتی نقصان کم نظر آرہا ہے مگر وسائل اور فضلہ کے شعبے میں مطلق کمی نہیں ہے۔

یہ ساری صورتحال عالمی سیاست سے براہ راست جڑی ہوئی ہے، جہاں سرمایہ دارانہ نظام کی مسلسل توسیع کی ضرورت سیاسی فیصلوں کو متاثر کرتی ہے، جس کے نتیجے میں "فوسل فیولز" کو اربوں ڈالر کی سبسڈیز (2024 میں تقریباً 916 بلین ڈالر) دی جاتی ہیں، کارپوریٹ لابینگ (جیسے COP29 اور COP30 میں 1600 سے زائد فوسل فیول لابیسٹس کی موجودگی) کے ذریعے ماحولیاتی ضوابط کمزور کیے جاتے ہیں، اور بین الاقوامی معاہدوں جیسے COP کانفرنسز میں "فوسل فیول انڈسٹری" کی مداخلت کی وجہ سے حقیقی پیشرفت رک جاتی ہے۔

یہاں "فوسل فیول انڈسٹری" کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ اس صنعت کو کہتے ہیں جو زمین کے اندر سے نکلنے والے ایندھن جیسے "کوئلہ، تیل اور گیس" کو نکالنے، صاف کرنے اور توانائی کے طور پر استعمال کرنے کا کام کرتی ہے۔ سادہ لفظوں میں، یہ وہ سرمایہ داروں کے کاروبار اور کارخانے ہیں جو ان ایندھنوں سے بجلی تیار کرتے، گاڑیاں بناتے اور فیکٹریاں چلاتے ہیں۔ چونکہ یہ ایندھن لاکھوں سال پرانے نباتات اور جانداروں کی باقیات سے بنے ہیں، اس لیے انہیں "فوسل فیول" کہا جاتا ہے۔ فوسل فیول کی اس آلودگی کو ترقی یافتہ ممالک کی حکومتیں ترقی پذیر ممالک میں برآمد کرتی ہیں اور عالمی مقابلے میں ماحولیاتی تحفظ کو نظرانداز کرتی ہیں، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کارآمدی کے دعووں کے باوجود مجموعی ماحولیاتی تباہی بڑھ رہی ہے، اور سرمایہ داری کی یہ سیاسی شکل بحران کو نہ صرف برقرار رکھ رہی بلکہ اسے مزید بڑھا رہی ہے۔

ماحولیاتی بحران میں سے خاص طور پر موسمیاتی تبدیلیاں، آج کی دنیا کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔ یہ نہ صرف قدرتی ماحول کو متاثر کر رہا ہے بلکہ عالمی سیاست، معیشت اور سلامتی کو بھی تبدیل کر رہا ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد سے انسانی سرگرمیوں، خاص طور پر فوسل فیولز کے استعمال نے گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج کو بڑھایا ہے، جس سے زمین کا درجہ حرارت بڑھ رہا ہے۔ یہ بحران ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان ناانصافی کو بھی اجاگر کرتا ہے، کیونکہ ترقی یافتہ ممالک تاریخی طور پر زیادہ ذمہ دار ہیں، جبکہ ترقی پذیر ممالک اس کے شدید اثرات برداشت کر رہے ہیں۔ عالمی سیاست میں یہ مسئلہ اقوام متحدہ کی کانفرنسوں، پیرس معاہدے اور دیگر بین الاقوامی کوششوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔

اسی ضمن میں "ڈیوڈ ویلیس ویلز" (David Wallace Wells) لکھتے ہیں:

> "The only plausible explanation for the rise in weather-related catastrophes is climate change. The view that weatherextremes are more frequent and intense due to global warming coincides with the current state of scientific knowledge."(6)

یہ اقتباس بتاتا ہے کہ شدید موسم کی تبدیلیاں کا ہی نتیجہ ہیں۔ عالمی سیاست میں موسمیاتی تبدیلیاں اب ایک نئی جہت بن چکی ہیں۔ پیرس معاہدہ (2015) اس کی سب سے بڑی دلیل ہے، جس میں تقریباً تمام ممالک نے درجہ حرارت میں اضافے کو 1.5 سے 2 ڈگری سینٹی گریڈ تک محدود کرنے کا عہد کیا۔ تاہم، نفاذ میں مشکلات ہیں، کیونکہ امیر ممالک مالی امداد کے وعدے پورے نہیں کر رہے۔

"اینتھونی گڈنز" اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> "Martin Luther King did not stir his audience in 1963 by declaiming 'I have a nightmare."(7)

"اینتھونی گڈنز" اس اقتباس میں "مارٹن لوتھر کنگ" کے تاریخی جملے کو بطور علامت استعمال کرتے ہیں تاکہ یہ واضح کیا جاسکے کہ سماجی و سیاسی تبدیلی محض خوف اور تباہی کے بیانیے سے ممکن نہیں ہوتی۔ وہ بتاتے ہیں کہ اگر کنگ 1963ء میں "مجھے ایک ڈراؤنا خواب آیا ہے" کہتے تو وہ عوام کو متحرک نہ کر پاتے، کیونکہ خوف مفلوج کرتا ہے

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

جبکہ امید عمل پر آمادہ کرتی ہے۔ اسی مثال کے ذریعے گڈنز موسمیاتی بحران کی سیاست پر روشنی ڈالتے ہیں کہ اگرچہ یہ ایک فوری اور سنگین خطرہ ہے، لیکن اسے صرف خوفناک انجام کے طور پر پیش کرنا عوامی بے حسی کو جنم دیتا ہے؛ مؤثر بیانیہ وہی ہے جو خطرے کے ادراک کے ساتھ ساتھ بہتر مستقبل کی امید بھی فراہم کرے، تاکہ اجتماعی عمل اور سیاسی جدوجہد ممکن ہو سکے۔

اگر عالمی سیاست کو ماحولیاتی بحران کے تناظر میں مزید دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ عالمی سیاست موسمیاتی تبدیلی کے حل میں ظاہری طور پر مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک طرف ممالک کو تعاون پر مجبور کرتی ہے، جیسے اقوام متحدہ کے فریم ورک کنونشن آن کلائمیٹ چینج (UNFCCC) کے تحت پیرس معاہدہ (2015)، COP کانفرنسز اور نیشنلی ڈٹرمنڈ کنٹریبیوشنز (NDCs) کے ذریعے مشترکہ اہداف طے کرنا۔ نیشنلی ڈٹرمنڈ کنٹریبیوشنز (NDCs) سے مراد وہ قومی وعدے اور اہداف ہیں جو ہر ملک ”پیرس معاہدے“ کے تحت خود طے کرتا ہے تاکہ گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں کمی کی جاسکے اور موسمیاتی تبدیلی کے اثرات سے نمٹا جاسکے۔ ان میں یہ بتایا جاتا ہے کہ کوئی ملک کتنی حد تک آلودگی کم کرے گا، صاف توانائی کو کیسے فروغ دے گا اور موسمیاتی خطرات سے بچاؤ کے لیے کیا اقدامات کرے گا۔ ہر چند سال بعد ممالک اپنے NDCs کو بہتر اور مضبوط بنانے کے پابند ہوتے ہیں، تاکہ عالمی سطح پر درجۂ حرارت میں اضافے کو قابو میں رکھا جاسکے۔ یہ سب ادارے اور معاہدے ممالک کو اخراج کم کرنے، موافقت اور مالی امداد کے لیے پابند کرتے ہیں۔ تاہم، دوسری طرف عالمی سیاست اکثر رکاوٹ بنتی ہے، کیونکہ یہ قومی مفادات، جیوپولیٹیکل تنازعات، اقتصادی ترجیحات اور طاقت کی سیاست پر مبنی ہوتی ہے، جو ماحولیاتی بحران کو مزید سنگین بناتی ہے۔

عالمی سیاست کا منفی کردار اس بات سے واضح ہے کہ ماحولیاتی مسائل عالمی نوعیت کے ہیں، لیکن سیاسی فیصلے قومی سطح پر ہوتے ہیں، جو اکثر مفادات کے ٹکراؤ کا شکار رہتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک تاریخی ذمہ داری تسلیم کرتے ہیں لیکن مالی امداد اور ٹیکنالوجی ٹرانسفر میں بخل کرتے ہیں، جبکہ ترقی پذیر ممالک اقتصادی ترقی اور توانائی کی سیکورٹی کو ترجیح دیتے ہیں۔ نتیجتاً، معاہدے کمزور اور رضاکارانہ (non-binding) رہ جاتے ہیں، جو موثر نفاذ کو ناممکن بناتے ہیں۔

پیرس معاہدے کی ناکامی کی بات کریں تو یہ معاہدہ، جو 2015 میں طے پایا، عالمی درجہ حرارت میں اضافے کو 1.5°C تک محدود کرنے کا ہدف رکھتا تھا، جس کے لیے عالمی اخراج کو 2025 تک پیک پر پہنچانا اور پھر کم کرنا ضروری تھا۔ تاہم، 2026 کے آغاز تک یہ ہدف ناکام ہو چکا ہے۔ UNEP کی Emissions Gap Report 2025 کے مطابق، نئی NDCs کے باوجود عالمی گرمائش 2.3-2.5°C تک پہنچنے کی طرف جارہی ہے، جو پیرس کے 1.5°C ہدف سے بہت دور ہے۔ عالمی اخراج 2025 میں پیک ہونے کے بجائے بڑھ رہے ہیں یا plateau پر ہیں، اور 1.5°C کو برقرار رکھنے کا امکان صرف 22٪ ہے۔ مزید برآں، امریکا کا (جنوری 2026) معاہدے سے انخلا (دوسری بار) اس کی ناکامی کی علامت ہے، جو عالمی اخراج کا بڑا حصہ رکھتا ہے۔ یہاں یہ تفصیل بتانا ضروری ہے کہ امریکا نے پیرس آب وہوا معاہدے سے دوبار الگ ہونے کا اعلان کیا ہے۔ پہلی بار 2017 میں صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے اس معاہدے سے نکلنے کا فیصلہ کیا، جس کا باقاعدہ نوٹیفکیشن 4 نومبر 2019 کو اقوام متحدہ کو دیا گیا اور یہ علیحدگی 4 نومبر 2020 کو مکمل طور پر نافذ ہوئی۔ بعد میں جو بائیڈن نے صدارت سنبھالتے ہی فروری 2021 میں امریکا کو دوبارہ اس معاہدے کا حصہ بنادیا۔

اب دوسری بار، صدر ٹرمپ نے اپنی دوسری مدتِ صدارت کے پہلے دن یعنی 20 جنوری 2025 کو ایگزیکٹو آرڈر جاری کر کے امریکا کو ایک بار پھر پیرس معاہدے سے الگ کرنے کا حکم دیا۔ اس کے تحت رسمی نوٹیفکیشن 27 جنوری 2025 کو اقوام متحدہ کو پیش کیا گیا۔ پیرس معاہدے کے آرٹیکل 28 کے مطابق، علیحدگی کا عمل نوٹیفکیشن کی تاریخ سے ایک سال بعد مؤثر ہوتا ہے۔ لہٰذا آج کی تاریخ تک امریکا ابھی بھی تکنیکی طور پر اس معاہدے کا رکن ہے، مگر 27 جنوری 2026 کو یہ علیحدگی مکمل طور پر نافذ ہو جائے گی۔ اس دن کے بعد امریکا دوبارہ عالمی موسمیاتی معاہدے سے باہر ہو جائے گا۔

اس سے ثابت ہوا کہ کس طرح طاقت ور ملک انسانیت سوز عالمی بحران میں ذاتی مفادات کی وجہ سے توجہ نہیں دے رہے اور اسی وجہ سے (30COP 2025) میں بھی فوسل فیولز کے ایشو پر کوئی واضح لائحہ عمل نہ بن سکا، جو سیاسی دباؤ اور مفادات کی وجہ سے ہے۔ یہ ناکامی عالمی سیاست کی وجہ سے ہے، جو بلند اہداف اور عملی اقدامات کے درمیان خلا کو برقرار رکھتی ہے اور عمل درآمد میں تاخیر کا سبب بنتی ہے۔

جیوپولیٹیکل تنازعات اور توانائی کی سیکورٹی کا مسئلہ بھی درپیش ہے۔ جیوپولیٹیکل تناؤ، جیسے روس، یوکرین جنگ یا امریکہ، چین کشیدگی، ماحولیاتی تعاون کو متاثر کرتے ہیں۔ مثلاً، روس، یوکرائن جنگ میں روس نے گیس کی سپلائی روک دی تو اس کی وجہ سے یورپ میں کوئلہ کا استعمال بڑھ گیا، جس سے مضر گیسز کے اخراج میں اضافہ ہوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے یہ ممالک توانائی کی سیکورٹی کو ماحولیاتی تحفظ پر ترجیح دیتے ہیں، جو گرین ٹرانزیشن کو سست کرتا ہے۔

عالمی ادارے متعدد معاہدے تو کرتے ہیں لیکن سیاسی طاقت کی کمی کی وجہ سے عمل درآمد ناکام ہے۔ فوسل فیول لابی (تیل برآمد کرنے والے ممالک جیسے سعودی عرب، روس) سخت معاہدوں کی مخالفت کرتی ہے۔ طاقتور ممالک اور کارپوریشنز فوسل فیولز کو برقرار رکھتے ہیں، جبکہ ترقی پذیر ممالک کو وعدہ شدہ سالانہ امداد بھی مکمل نہیں ملتی۔ یہ عدم اعتماد تعاون کو کمزور کرتا ہے۔ عالمی سیاست کا یہ منفی کردار اس حقیقت سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ 2025 تک عالمی اخراج میں خاطر خواہ کمی نہیں آئی، اور COP کانفرنسز میں اکثر اتفاق رائے نہیں ہو پاتا۔ عالمی سیاست کو ماحولیاتی بحران سے نمٹنے کے لیے قومی مفادات سے بالاتر ہو کر انصاف پر مبنی، پابند اور تیز رفتار تعاون کی ضرورت ہے، ورنہ بحران ناقابل تلافی حد تک سنگین ہو جائے گا۔

یہ ماحولیاتی مسائل ابتدا سے ہی عالمی سیاست کا حصہ بن گئے ہیں۔ جب ایک ماحولیاتی تبدیلی کو بین الاقوامی مسئلہ تسلیم کیا جاتا ہے، تو ممالک کے درمیان مذاکرات شروع ہوتے ہیں۔ رونالڈ بی۔ مچل اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> "A consensus about the existence, causes, and importance of an environmental problem does not always produce a consensus among states on whether, let alone what, international action to take. Even after an environmental change becomes a topic for international discussion, highly concerned states may fail to prompt international action." (8)

یہ اقتباس یہ بتاتا ہے کہ ماحولیاتی مسائل پر اتفاق رائے ہونے کے باوجود، ممالک کے درمیان کارروائی پر اختلافات رہتے ہیں، جو عالمی سیاست کو پیچیدہ بناتے ہیں۔ بعض اوقات ماحولیاتی بحران کچھ ممالک کو تعاون پر مجبور کرتا ہے، لیکن یہ تعاون ہمیشہ آسان نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر، موسمیاتی تبدیلی جیسے مسائل میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان تنازعات پیدا ہوتے ہیں۔ مچل مزید لکھتے ہیں:

> "States' interests are major influences on regime formation and design. Scholars have proposed various typologies of interest configurations and conflict types to explain the chances for success of international negotiations."(9)

یہاں ممالک کے مفادات کو ماحولیاتی مذاکرات کی کامیابی کا کلیدی عنصر قرار دیا گیا ہے۔ عالمی اداروں اور مذاکرات کی اہمیت ماحولیاتی بحران کو حل کرنے کے لیے عالمی ادارے جیسے اقوام متحدہ اور مختلف معاہدے (جیسے پیرس معاہدہ) اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تاہم، یہ ادارے ممالک کی خود مختاری اور مفادات کے سامنے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ کتاب میں بیان کیا گیا ہے:

> "Power influences whether pushers succeed in establishing an IEA. International treaties are voluntary contracts among sovereign states. States cannot be forced to participate in negotiations or join IEAs once they are formed. They must be convinced that it is in their interests to do so."(10)

اس اقتباس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ عالمی معاہدوں کی کامیابی ممالک کی رضامندی پر منحصر ہے، جو سیاسی طاقت اور مفادات سے متاثر ہوتی ہے۔ اس تناظر میں ڈیوڈ سپلیٹ اور دیگر ماہرین لکھتے ہیں کہ موسمیاتی سیاست میں طاقت کا توازن تبدیل ہو رہا ہے، اور ترقی پذیر ممالک انصاف کا مطالبہ کر رہے ہیں:

> "After nearly a quarter century of international negotiations on climate change, we stand at a crossroads."(11)

اس کتاب میں عالمی سیاست میں ناانصافی اور غیر مساوی اقدامات پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ گریٹا تھنبرگ (Greta Thunberg) کا ذکر بھی بہت ضروری ہے یہ ایک سویڈش ماحولیاتی کارکن ہیں جو 2003 میں پیدا ہوئیں۔ 2018 میں صرف 15 سال کی عمر میں انہوں نے سویڈن کی پارلیمنٹ کے باہر سکول سٹرائیک فار کلائمیٹ شروع کی، جس نے دنیا بھر میں Fridays for Future تحریک کو جنم دیا۔ وہ عالمی سطح پر ماحولیاتی بحران کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں اور اقوام متحدہ، ڈیوس فورم اور دیگر بڑے پلیٹ فارمز پر تقریریں کر چکی ہیں۔ ان کی کتاب "The Climate Book: The Facts and the Solutions" میں 100 سے زائد ماہرین کے

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

مضامین شامل ہیں، جو ماحولیاتی بحران کی سائنسی حقیقت اور اس کی عالمی سیاست کو بے نقاب کرتی ہے۔ ان کا واضح پیغام ہے: "ہمارے پاس اب بھی وقت ہے، لیکن یہ تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔" گریٹا تھنبرگ اپنی اسی کتاب میں عالمی سیاسی پہلو کو اجاگر کیا ہے:

> "'We can still do this,' the powerful voices of the Global North say in their tremendous struggle to maintain a system that has been proved flawed, incapable and doomed in more ways than we can possibly imagine."(12)

ماحولیاتی بحران عالمی سیاست کا لازمی حصہ بن چکا ہے۔ اسے حل کرنے کے لیے بین الاقوامی تعاون، انصاف اور فوری عمل ضروری ہے۔ اگر ہم نے اب اقدامات نہ کیے تو مستقبل کی نسلیں شدید مشکلات کا شکار ہوں گی۔ عالمی رہنماؤں کو ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر کام کرنا ہوگا۔ اس بحران کے حل کا راستہ سماجی اور معاشی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی سے ممکن ہے، نہ کہ صرف تکنیکی اصلاحات سے۔

جدید ماحولیاتی بحران طبقاتی نقطۂ نظر سے بھی غیر مساوی اثرات رکھتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک صنعتی اخراج کے بڑے ذمہ دار ہیں، مگر ماحولیاتی آفات کا بوجھ ترقی پذیر ممالک، مزدور طبقے، اور پسماندہ طبقات کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اسی ضمن میں جاوید اکبر انصاری لکھتے ہیں: (ترجمہ)

> "ماحولیاتی بحران صرف فطرت کی تباہی نہیں، بلکہ سماجی انصاف کے بحران کی علامت بھی ہے۔ محنت کش طبقہ، خواتین، اور نوآبادیاتی دنیا کے عوام اس بحران کا سب سے زیادہ شکار ہیں۔" (13)

مادی جدلیاتی زاویے سے دیکھا جائے تو فطرت کے ساتھ انسانی تعلق دوطرفہ تعامل ہے۔ انسان فطرت کو بدلتا ہے، مگر فطرت بھی انسان کو بدلتی ہے۔ اس لحاظ سے ماحولیاتی تبدیلی ایک "معاشرتی فطری مظہر" (Socio-Natural Phenomenon) ہے، جو انسانی پیداوار کے تاریخی انداز سے منسلک ہے۔ لہٰذا جب تک پیداوار کے تعلقات میں بنیادی تبدیلی نہیں آتی، یعنی جب تک سرمایہ کی بالادستی کے بجائے اجتماعی ضرورت کو مرکزیت نہیں دی جاتی، تب تک ماحولیاتی بحران سے مستقل اور حقیقی نجات ممکن نہیں۔

مارکسی نقطہ نظر سے بھی یہ بات ہی سامنے آتی ہے کہ سرمایہ دارانہ پیداوار فطرت کے ساتھ انسان کے مستقل تعامل کو توڑ دیتی ہے، اور زمین کو اس کی حیاتیاتی صلاحیت سے محروم کرتی ہے۔ اس تناظر میں ماحولیاتی تبدیلی کو صرف سائنس یا پالیسی کا معاملہ نہیں بلکہ ایک سماجی معاشی جدوجہد کا حصہ سمجھنا چاہیے۔ مارکسی نقطہ نظر اور دیگر مفکرین کی روشنی میں دیکھا جائے تو ماحولیاتی بحران کا حل صرف ٹیکنالوجی نہیں بلکہ ایک نئی "سیاسی معیشت" ہے، جسے "ایکو سسٹم" کہا جاتا ہے۔ جس میں فطرت کو ایک زندہ اور خود مختار نظام کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

ایکو سسٹم (Ecosystem) ایک جغرافیائی علاقے میں موجود تمام جانداروں (جیسے پودے، جانور، جراثیم) اور غیر جاندار اجزاء (جیسے مٹی، پانی، ہوا، درجہ حرارت اور روشنی) کا وہ متحرک نظام ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ تعامل کرتے ہوئے غذائی سائیکلوں، توانائی کے بہاؤ اور ماحولیاتی توازن کے ذریعے زندگی کو برقرار رکھتا ہے۔ یہ نظام قدرتی طور پر خود کو منظم کرتا ہے، جہاں حیاتیاتی (Biotic) اور غیر حیاتیاتی (Abiotic) عوامل ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے اور تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ماحولیاتی بحران کے تناظر میں، ایکو سسٹم کی اہمیت اس لیے مزید بڑھ جاتی ہے کیونکہ موجودہ عالمی مسائل جیسے آب و ہوا کی تبدیلی، حیاتیاتی تنوع کا خاتمہ، آلودگی، جنگلات کی کٹائی اور وسائل کا زیادہ استعمال ان نظاموں کے توازن کو شدید طور پر خراب کر رہے ہیں، جس سے انواع کے معدوم ہونے، غذائی زنجیروں کے ٹوٹنے، مٹی کی زرخیزی کے خاتمے اور انسانی بقا کو خطرے کا سامنا ہے؛ یہ بحران بنیادی طور پر انسانی سرگرمیوں، خاص طور پر سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی مسلسل توسیع سے پیدا ہوا ہے جو ماحولیاتی حدود کو نظر انداز کرتا ہے۔

برطانوی سوشلسٹ اور ماہر ماحولیات A. G. Tansley، جو برٹش ایکولوجیکل سوسائٹی کے پہلے صدر بنے، نے 1930 کی دہائی میں "ایکو سسٹم" کی اصطلاح وضع کی تھی، جو ماحولیاتی نظام کی ایکولوجی کے بارے میں ہماری جدید تفہیم کے لیے مرکزی ہے اور اب یہ اپنا ایک الگ علمی تحقیقی میدان بن چکا ہے۔ Tansley یہ بتانا چاہتے تھے کہ قدرتی برادریوں کے بارے میں ان کا مادہ پرست (materialist) تصور کس طرح تمام طبعی اور کیمیائی عوامل جیسے مٹی اور آب و ہوا کے ساتھ مل کر ایک متحرک توازن اور ضروری اتحاد تشکیل دیتا ہے، اور اس پیچیدہ باہمی تعلق کو مؤثر طریقے سے بیان کرنے کے لیے انہوں نے "ایکو سسٹم" کی اصطلاح متعارف کرائی، جو آج ماحولیاتی بحرانوں کو سمجھنے اور ان سے نمٹنے کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ وہ اس نظام کے بارے میں کہتے ہیں:

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

> "It is the systems so formed which, from the point of view of the ecologist, are the basic units of nature on the face of the earth. Our natural human prejudices force us to consider the organisms as the most important parts of these systems, but certainly inorganic "factors" are also parts—there could be no systems without them, and there is constant interchange of the most various kinds within each system, not only between the organisms but between the organic and the inorganic. These ecosystems, as we may call them, are the most various kinds and sizes. They form one category of the multitudinous physical systems of the universe, which range from the universe as a whole down to the atom."(14)

ایکو سسٹم کو سادہ الفاظ میں سمجھیں تو یہ زمین پر فطرت کا ایک "بنیادی بلاک" یا اکائی ہے، جیسے ایک مکمل یونٹ جو خود میں پورا ہوتا ہے۔ ماہرِ ماحولیات A. G. Tansley کے مطابق، یہ نظام صرف پودوں، جانوروں اور جراثیموں پر مشتمل نہیں ہوتا، بلکہ ان کے ساتھ مٹی، پانی، ہوا، سورج کی روشنی اور درجہ حرارت جیسے غیر جاندار چیزوں کو بھی شامل کرتا ہے۔ ہم انسان فطری طور پر سوچتے ہیں کہ جاندار ہی سب سے اہم ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ غیر جاندار حصے بھی اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے بغیر کوئی نظام چل ہی نہیں سکتا۔

اس نظام کے اندر ہر وقت تبادلہ اور لین دین ہوتا رہتا ہے: جاندار ایک دوسرے سے اور غیر جاندار چیزوں سے مواد اور توانائی لیتے اور دیتے رہتے ہیں، جیسے پودے مٹی سے غذائی اجزاء لیتے ہیں اور آکسیجن چھوڑتے ہیں۔ یہ ایکو سسٹم چھوٹے سے چھوٹا (جیسے ایک تالاب) سے لے کر بہت بڑا (جیسے ایک جنگل یا سمندر) تک ہو سکتا ہے۔ Tansley کی بات کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ نظام کائنات کے بے شمار جسمانی نظاموں میں سے ایک قسم ہیں۔ بالکل جیسے کائنات خود ایک بہت بڑا نظام ہے اور ایٹم ایک چھوٹا سا۔ یعنی ایکو سسٹم فطرت کو سمجھنے کا وہ بنیادی طریقہ ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ سب کچھ ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے اور الگ الگ نہیں دیکھا جا سکتا۔ اور، مارکسی جدلیات ہمیں زندگی کے عمل کی مسلسل حرکت اور باہمی مربوطیت کو سمجھنے میں کس طرح مدد دیتی ہے، اس کی وضاحت "جان بیلامی فوسٹر" یوں کرتے ہیں: (ترجمہ)

> "جو نظام ہم ذہنی طور پر الگ کرتے ہیں، وہ نہ صرف بڑے نظاموں کے حصے کے طور پر شامل ہوتے ہیں، بلکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اوورلیپ بھی ہوتے ہیں، آپس میں جڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔"(15)

ماحولیاتی تباہی اور عالمی حرارت بڑھنے سے فکر مند بہت سے لوگ پائیدار حل کو انفرادی ذمہ داری کے ساتھ بھی جوڑتے ہیں۔ نظام کے اندر رہ کر اپنا ذاتی کاربن فٹ پرنٹ کم کرنا، سائیکل پر کام پر جانا، گوشت نہ کھانا، ری سائیکلنگ کو یقینی بنانا، یا بوتل کا پانی نہ پینا وغیرہ جیسے اقدامات کو کرنے پر زور دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے یہ توجہ انفرادی طرزِ زندگی کی تبدیلیوں پر ہے تاکہ عملی طور پر دکھایا جائے کہ ایک متبادل، زیادہ پائیدار زندگی کیسی ہو سکتی ہے اور ایک ایک شخص سے پائیدار دنیا کی پیش گوئی کی جائے۔

ایک طبقے کی رائے کچھ یوں ہے کہ ذاتی اقدامات کرنے سے ماحولیاتی بحران ختم ہو سکتا ہے مگر انہیں ایک سیاسی حکمت عملی سے الجھانا نہیں چاہیے وہ حقیقی تبدیلی لانے کی بات کرتے ہیں، جو ہر کوئی دیکھنا بھی چاہتا ہے۔ ان دونوں خیالات کی روشنی میں دیکھیں کہ اگر لوگ لائف سٹائل بدلتے ہوئے اسی سیاسی و معاشی نظام کو اپناتے ہیں تو وہ خود کو بالکل ویسے ہی دیکھتے ہیں جیسے کارپوریٹ اور سیاسی اشرافیہ ہمیں بطور صارفین ہی دیکھنا چاہتی ہے۔ اس سے ماحولیاتی نقصان اور آلودگی مزید بڑھتی جاتی ہے، جبکہ ہم یہ باور کروا کر سکون میں رہتے ہیں کہ ہم واقعی کچھ کر رہے ہیں، ری سائیکلنگ اس کی کلاسک مثال ہے۔ اگر ہم خود کو بنیادی طور پر صارف سمجھتے ہیں تو وہ ہمیں کوڑا کرکٹ بیچنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور نکال لیں گے۔ جیسا کہ انہوں نے نئی "گرین" مصنوعات، آرگینک اور کاربن نیوٹرل اشیاء، ہائبرڈ گاڑیوں وغیرہ کے ساتھ کامیابی سے کیا ہے، جو منافع کو بنیادی ہدف بنانے والے نظام میں مقابلے کی بنیاد پر مسلسل ترقی کے تقاضے کو چیلنج کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر رہی ہیں۔ یہ سب عارضی اور کم مدتی اقدامات ہیں جن سے خاطر خواہ اور جلدی رونما ہونے والے نتائج ممکن نہیں ہیں۔ اس بحران سے نکلنے کے لیے پائیدار حل تلاش کرنا ہو گا۔

کارل مارکس اسی وجہ سے زمین کے بارے میں طویل المدتی نقطۂ نظر رکھنے میں فکر مند تھے، ایک صدی پہلے جب اقوام متحدہ نے یہ ماحولیاتی بحران کا مسئلہ دریافت بھی نہیں کیا تھا۔ تب ہی مارکس نے اپنی کتاب "داس کیپیٹل" کی تیسرے جلد میں انہوں نے اس بحران کے مستقل بنیادوں پر قائم پائیدار حل کو یوں بیان کیا ہے:

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

> "From the standpoint of a higher socio-economic formation, the private property of particular individuals in the earth will appear just as absurd as the private property of one man in other men. Even an entire society, a nation, or all simultaneously existing societies taken together, are not owners of the earth, they are simply its possessors, its beneficiaries, and have to bequeath it in an improved state to succeeding generations, as boni patres familias [good heads of household."(16)

ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

> ایک اعلیٰ سماجی معاشی تشکیل کے نقطۂ نظر سے، زمین پر انفرادی افراد کی نجی ملکیت اتنی ہی بے معنی نظر آئے گی جتنی ایک انسان کی دوسرے انسانوں پر نجی ملکیت۔ ایک پورا معاشرہ، ایک قوم، یا ایک ہی وقت میں موجود تمام معاشرے مل کر بھی زمین کے مالک نہیں ہیں، وہ صرف اس کے عارضی مالک ہیں، اس کے فائدہ اٹھانے والے ہیں، اور اچھے گھر کے سربراہوں کی طرح انہیں آنے والی نسلوں کے لیے بہتر حالت میں چھوڑ کر جانا چاہیے۔

نجی ملکیت کا نظریہ ایک غیر فطری عمل کے طور پر سامنا آتا ہے۔ نجی ملیکت میں زمین کو بہ طور مشین استعمال کیا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ منافع کمایا جا سکے۔ فطرت اور انسانی معاشرے کو ایک دوسرے کے بالکل مخالف نہیں سمجھا جا سکتا، بلکہ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ترقی کرنی چاہیے کیونکہ قدرتی تاریخ اور انسانی تاریخ ایک ہی عمل کے مختلف پہلو بن جاتی ہیں۔ مارکس کے نزدیک، سرمایہ داری نے انسانیت اور فطرت کے درمیان قدرتی "میٹابولک تعامل" کو توڑ دیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا تھا کہ "میٹابولک رِف" (Metabolic Rift) سے مراد ایک اہم ماحولیاتی اور معاشی تصور ہے جو کارل مارکس کے خیالات سے نکلا ہے۔ یہ اصطلاح جدید دور میں خاص طور پر جان بیلامی فوسٹر (John Bellamy Foster) نے مشہور کی ہے۔ اس کا مطلب ہے انسان اور فطرت کے درمیان قدرتی مادّی تبادلے میں پیدا ہونے والی ناقابلِ تلافی دراڑ ہے۔ کارل مارکس کے مطابق سرمایہ دارانہ نظام نے شہری دیہی علیحدگی، صنعتی زراعت اور وسائل کی لوٹ مار کے ذریعے یہ توازن توڑ دیا ہے۔ نتیجتاً زمین سے غذائی اجزا نکال لیے جاتے ہیں مگر واپس نہیں لوٹائے جاتے، جس سے مٹی کی زرخیزی کم ہوتی ہے، کیمیائی کھادوں کا استعمال بڑھتا ہے اور ماحولیاتی بحران جنم لیتا ہے۔ یہی تصور "ایکو سوشلزم" میں سرمایہ داری کے ماحولیاتی تضاد کو سمجھنے کا اہم ذریعہ ہے۔ اس کے مطابق غذائی اجزاء اور مواد کا قدرتی چکر (جیسے مٹی سے فصلوں تک اور واپس مٹی میں) منافع کی دوڑ میں رک جاتا ہے، جس سے مٹی کی زرخیزی، حیاتیاتی تنوع اور ماحولیاتی توازن تباہ ہوتا ہے۔ اس دراڑ کو ٹھیک کرنے کے لیے کارل مارکس ایک ایسے سماجی نظام کی بات کرتے تھے جہاں پیداوار انسانی ضرورت اور فطرت کے توازن پر مبنی ہو، نہ کہ نجی منافع پر، تاکہ فطرت اور انسان دوبارہ ہم آہنگ ہو سکیں اور زمین کو آنے والی نسلوں کے لیے بہتر حالت میں منتقل کیا جا سکے۔

یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس موجودہ ماحولیاتی بحران کا حل صرف انفرادی طرزِ زندگی کی تبدیلیوں (جیسے ری سائیکلنگ یا کاربن فٹ پرنٹ کم کرنا) میں نہیں بلکہ سرمایہ داری کے بنیادی ڈھانچے میں انقلاب میں ہے۔ سرمایہ داری نظام میں لوگوں کو صارفین کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور "گرین" مصنوعات بیچ کر نظام کو برقرار رکھا جاتا ہے، جبکہ مارکسی نقطۂ نظر سے پائیداری کا حقیقی مطلب زمین کو نجی ملکیت سے آزاد کر کے اجتماعی طور پر اس کا ذمہ دارانہ استعمال کرنا ہے۔ اس مباحث سے ثابت ہوتا ہے کہ ماحولیاتی بحران سرمایہ داری کا لازمی نتیجہ ہے اور اس کا حل اشتراکیت (سوشلزم) میں مضمر ہے۔

References: حوالہ جات

1.Karl Marx, Capital, vol. 1 (New York International Publishers, 1967), P No:505–506.
2. Burkett, Paul. Marxism and Ecological Economics: Toward a Red and Green Political Economy.(Brill Press, 2014)P:62.
3. Frederick Engels, "The Part Played by Labor in the Transition from Ape to Man," inThe Origin of the Family, Private Property and the State (New York: International Publishers, 2007),P: 260–261

ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 03 Issue No: 01 (2026)

4. Barry, John. “Marxism and Ecology: From Political Economy to Political Ecology.” Marxism and Reality, Vol. 2 (2009), P: 104
5. James Gustave Speth, The Bridge at the End of the World: Capitalism, The Environment, and Crossing from Crisis to Sustainability (New Haven, CT: Yale University Press, 2008) P: No.56
6. David Wallace-Wells, The Uninhabitable Earth: Life After Warming,(Knopf Publishing Group, New York, 2019)P: 34
7. Anthony Giddens, The Politics of Climate Change, (Polity Press, Cambridge, 2009),P: 2
8. Mitchell, Ronald B. International Politics and the Environment.(SAGE Publications Ltd, London, 2009), P:112
9. Ibid.P: 115
10. Ibid.P: 117
11. David Ciplet, J. Timmons Roberts, and Mizan R. Khan, Power in a Warming World: The New Global Politics of Climate Change and the Remaking of Environmental Inequality, MIT Press, Cambridge, Massachusetts, 2015), P No.: 1)
12. Greta Thunberg (editor), The Climate Book: The Facts and the Solutions, Penguin Press, New York, 2022), P: 45)
13. Ansari, Javed Akbar et al. “An Evaluation of the Marxist Approach to the Environmental Crises.” New Horizons, Vol. 14, No. 1 (2020), P: 167
14. A.G. Tansley, "The Ecosystem, ”reprinted in Keeping Things Whole: Readings in Environmental Science (Chicago: Great Books Foundation, 2003), P:191.
15. John Bellamy Foster, The Ecological Revolution: Making Peace with the Planet(New York:Monthly Review Press, 2009), P:159.
16. John Bellamy Foster, The Ecological Revolution: Making Peace with the Planet(New York:Monthly Review Press, 2009) P:181